دستِ تہِ سنگ

فیض احمد فیض

مکتبۂ کارواں، کچہری روڈ، لاہور

دستِ تہِ سنگ

فیض احمد فیض

مکتبۂ کارواں کچہری روڈ ۔ لاہور

جملہ حقوق محفوظ

ناشر :

چودھری عبدالحمید
ایم اے (علیگ)

مطبع :

مسعود پرنٹرز
۸۸ میکلوڈ روڈ لاہور

قیمت :

[redacted] روپے

کتابت :

محمد حسین (شاہ)

اِنتساب

دیس پردیس کے یارانِ قدح خوار کے نام
حُسنِ آفاق، جمالِ لب و رخسار کے نام

ترتیب

سرِآغاز ، ۷
تقریر ، ۹
فیض از فیض ، ۱۵
قطعہ ، ۲۷
دستِ تہِ سنگ آمدہ ، ۲۸
قطعہ ، ۳۱
سفرنامہ ، ۳۲
جشن کا دن ، ۳۷
قطعات ، ۳۹
شام ، ۴۰
جمے گی کیسے بساطِ یاراں کہ شیشہ و جام بجھ گئے ہیں ، ۴۲
تم یہ کہتے ہو اب کوئی چارہ نہیں ، ۴۴
قطعہ ، ۴۷
بے دم ہوئے بیمار دوا کیوں نہیں دیتے ، ۴۸
شورشِ زنجیر بسم اللہ ، ۵۰
آج بازار میں پا بجولاں چلو ، ۵۲
یہ جفائے غم کا چارہ، وہ نجاتِ دل کا عالم ، ۵۴
قیدِ تنہائی ، ۵۶
قطعہ ، ۵۸

حمد ، ۵۹
ترے غم کو جاں کی تلاش تھی ترے جاں نثار چلے گئے ، ۶۱
قطعات ، ۶۳
کب ٹھہرے گا درد اے دل کب رات بسر ہوگی ، ۶۴
ملاقات مری ، ۶۵
ختم ہوئی بارشِ سنگ ، ۶۷
قطعہ ، ۶۹
آج یوں موج در موج غم تھم گیا اس طرح غم زدوں کو قرار آ گیا ، ۷۰
کہاں جاؤ گے ، ۷۲
یک بیک شورشِ فغاں کی طرح ، ۷۵
شہر یاراں ، ۷۷
نہ گنواؤ ناوکِ نیم کش دلِ ریزہ ریزہ گنوا دیا ، ۷۹
خوشا ضمانتِ غم ، ۸۱
جب تیری سمندر آنکھوں میں ، ۸۳
رنگ ہے دل کا مرے ، ۸۵
پاس رہو ، ۸۷
تری امید ترا انتظار جب سے ہے ، ۸۹
ہر سمت پریشاں تری آمد کے قرینے ، ۹۱
شرحِ فراق مدحِ لبِ مشکبو کریں ، ۹۳
منظر ، ۹۵

سرِ آغاز

شاید کبھی افشا ہو، نگاہوں پہ تمھاری
ہر سادہ ورق، جس سخنِ کشتہ سے خوں ہے
شاید کبھی اُس گیت کا پرچم ہو سرافراز
جو آمدِ صرصر کی تمنّا میں نگوں ہے
شاید کبھی اُس دل کی کوئی رگ تمھیں چُبھ جائے
جو سنگِ سرِ راہ کی مانند زبُوں ہے

فیض صاحب ، ماسکو کریملن میں لینن امن انعام تمغہ عطا ہونے کے بعد دائیں پروفیسر کدلاشن ، صدر

تقریر

فیض صاحب کی تقریر جو انھوں نے ماسکو میں بین الاقوامی
لینن امن انعام کی پُرشکوہ تقریب کے موقع پر اردو زبان میں کی:

محترم اراکینِ مجلسِ صدارت، خواتین اور حضرات!

الفاظ کی تخلیق و ترتیب شاعر اور ادیب کا پیشہ ہے لیکن زندگی میں بعض مواقع ایسے بھی آتے ہیں جب یہ قدرتِ کلام جواب دے جاتی ہے۔ آج عجزِ بیان کا ایسا ہی مرحلہ مجھے درپیش ہے۔ ایسے کوئی الفاظ میرے ذہن میں نہیں آرہے، جن میں اپنی عزّت افزائی کے لیے لینن پرائز کمیٹی، سوویٹ یونین کے مختلف اداروں، دوستوں اور آپ سب خواتین اور حضرات کا شکریہ خاطر خواہ طور سے ادا کرسکوں۔ لینن امن انعام کی عظمت تو اسی ایک بات سے واضح ہے کہ اس سے لینن کا محترم نام اور مقدس لفظ وابستہ ہے۔ لینن جو دورِ حاضر میں انسانی حریت کا سب سے بزرگ علم بردار ہے۔ اور امن جو انسانی

زندگی اور اس زندگی کے حسن و خوبی کی شرطِ اوّل ہے۔ مجھے اپنی تحریر و عمل میں ایسا کوئی کام نظر نہیں آتا جو اِس عظیم اعزاز کے شایانِ شان ہو۔ لیکن اس عزت بخشی کی ایک وجہ ضرور ذہن میں آتی ہے اور وہ یہ ہے کہ جس تمنّا اور آدرش کے ساتھ مجھے اور میرے ساتھیوں کو وابستگی رہی ہے یعنی امن اور آزادی کی تمنّا وہ بجائے خود اتنی عظیم ہے کہ اس واسطے سے ان کے حقیر اور ادنیٰ کارکن بھی عزّت اور اکرام کے مستحق ٹھہرتے ہیں۔

یوں تو ذہنی طور سے مجنون اور جرائم پیشہ لوگوں کے علاوہ سبھی مانتے ہیں کہ امن اور آزادی بہت حسین اور تابناک چیزیں ہیں اور یہ سبھی تصوّر کر سکتے ہیں کہ امن گندم کے کھیت ہیں اور سفیدے کے درخت، دلہن کا آنچل ہے اور بچّوں کے ہنستے ہوئے ہاتھ، شاعر کا قلم ہے اور مصوّر کا موئے قلم، اور آزادی ان سب صفات کی ضامن اور غلامی ان سب خوبیوں کی قاتل ہے جو انسان اور حیوان میں تمیز کرتی ہے۔ یعنی شعور اور ذہانت، انصاف اور صداقت، وقار اور شجاعت، نیکی اور رواداری۔ اس لیے بظاہر امن اور آزادی کے حصول اور تکمیل کے متعلق ہوشمند انسانوں میں اختلاف کی گنجائش نہ ہونا چاہیے... لیکن بدقسمتی سے یوں نہیں ہے۔ اس لیے نہیں ہے کہ انسانیت کی ابتدا سے آج

تک ہر عہد اور ہر دَور میں متضاد عوامل اور قوتیں برسرِ عمل اور برسرِ پیکار رہی ہیں۔ یہ قوتیں ہیں تخریب و تعمیر، ترقی اور زوال، روشنی اور تیرگی، انصاف دوستی اور انصاف دشمنی کی قوتیں۔ یہی صورت آج بھی ہے اور اسی نوعیت کی کشمکش آج بھی جاری ہے۔ لیکن ساتھ ہی ساتھ آج کل انسانی مسائل اور گذشتہ دَور کی انسانی الجھنوں میں کئی نوعیتوں سے فرق بھی ہے۔ دورِ حاضر میں جنگ سے دو قبیلوں کا باہمی خون خرابہ مراد نہیں ہے نہ آج کل امن سے خون خرابے کا خاتمہ مراد ہے۔ آج کل جنگ اور امن کے معنی ہیں امن آدم کی بقا اور فنا۔ بقا اور فنا ان دو الفاظ پر انسانی تاریخ کے خاتمے یا تسلسل کا دار و مدار ہے۔ انھیں پر انسانوں کی سرزمین کی آبادی اور بربادی کا انحصار ہے یہ پہلا فرق ہے۔ دوسرا فرق یہ ہے کہ اب سے پہلے انسانوں کو فطرت کے ذخائر پر اتنی دسترس اور پیداوار کے ذرائع پر اتنی قدرت نہ تھی کہ ہر گروہ اور برادری کی ضرورتیں پوری طرح سے تسکین پا سکتیں۔ اِس لیے آپس میں چھین جھپٹ اور لوٹ مار کا کچھ نہ کچھ جواز بھی موجود ہے، لیکن اب یہ صورت نہیں ہے۔ اب انسانی عقل، سائنس اور صنعت کی بدولت اس منزل پر پہنچ چکی ہے کہ جس میں سب تن بخوبی پل سکتے ہیں اور سبھی جھولیاں بھر سکتی ہیں۔ بشرطیکہ قدرت کے یہ بے بہا ذخائر پیداوار کے یہ بے اندازہ خرمن بعض

اجارہ داروں اور مخصوص طبقوں کی تسکینِ ہوس کے لیے نہیں، بلکہ جملہ انسانوں کی بہبود کے لیے کام میں لائے جائیں۔ اور عقل اور سائنس اور صنعت کی کل ایجادیں اور صلاحیتیں تخریب کے بجائے تعمیری منصوبوں میں صرف ہوں لیکن یہ جبھی ممکن ہے کہ انسانی معاشرے میں ان مقاصد سے مطابقت پیدا ہو اور انسانی معاشرے کے ڈھانچے کی بنائیں ہوسِ استحصال اور اجارہ داری کے بجائے انصاف، برابری، آزادی اور اجتماعی خوش حالی میں اٹھائی جائیں۔ اب یہ ذہنی اور خیالی بات نہیں، عملی کام ہے۔ اس عمل میں امن کی جد و جہد اور آزادی کی جد و جہد کی حدیں آپس میں مل جاتی ہیں۔ اس لیے کہ امن کے دوست اور دشمن اور آزادی کے دوست اور دشمن ایک ہی قبیلے کے لوگ ایک ہی نوع کی قوتیں ہیں۔ ایک طرف وہ سامراجی قوتیں ہیں جن کے مفاد، جن کے اجارے جبر اور حسد کے بغیر قائم نہیں رہ سکتے اور جنھیں ان اجاروں کے تحفظ کے لیے پوری انسانیت کی بھینٹ بھی قبول ہے۔ دوسری طرف وہ طاقتیں ہیں جنھیں بنکوں اور کمپنیوں کی نسبت انسانوں کی جان زیادہ عزیز ہے جنھیں دوسروں پر حکم چلانے کے بجائے آپس میں ہاتھ بٹانے اور ساتھ مل کر کام کرنے میں زیادہ لطف آتا ہے۔ سیاست و اخلاق، ادب اور فن۔ روزمرّہ زندگی، غرض کئی محاذوں پر، کئی صورتوں میں تعمیر اور تخریب انسان دوستی

اور انسان دشمنی کی یہ چپقلش جاری ہے ۔ آزادی پسند اور امن پسند لوگوں کے لیے
ان میں سے ہر محاذ اور ہر صورت پر توجہ دینا ضروری ہے ۔ مثال کے طور پر سامراجی
اور غیر سامراجی قوتوں کی لازمی کش مکش کے علاوہ بدقسمتی سے بعض ایسے ممالک
میں بھی شدید اختلافات موجود ہیں جنھیں حال ہی میں آزادی ملی ۔ ایسے اختلافات ہمارے
ملک پاکستان اور ہمارے سب سے قریبی ہمسایہ ہندوستان میں موجود ہیں ، بعض عرب
ہمسایہ ممالک میں موجود ہیں ، اور بعض افریقی حکومتوں میں موجود ہیں ۔ ظاہر ہے کہ ان
اختلافات سے وہی طاقتیں فایدہ اُٹھا سکتی ہیں جو امنِ عالم اور انسانی برادری کی
دوستی اور یگانگت کو پسند نہیں کرتیں ۔ اس لیے صلح پسند اور امن دوست صفوں میں
ان اختلافات کے منصفانہ حل پر غور و فکر اور اس حل میں امداد دینا بھی لازم ہے ۔

اب سے کچھ دن پہلے جب سوویٹ فضاؤں کا تازہ کارنامہ ہر طرف دنیا میں
گونج رہا تھا تو مجھے بار بار یہ خیال آتا رہا کہ آج کل جب ہم ستاروں کی دنیا میں بیٹھ کر
اپنی ہی دنیا کا نظارہ کر سکتے ہیں تو چھوٹی چھوٹی کمینگیاں ، خود غرضیاں ، یہ زمین
کے چند ٹکڑوں کو بانٹنے کی کوششیں اور انسانوں کی چند ٹولیوں پر اپنا سکّہ چلانے
کی خواہش کیسی بعید از عقل باتیں ہیں ۔ اب جبکہ ساری کائنات کے راستے ہم
پر کشادہ ہو گئے ہیں ۔ ساری دنیا کے خزینے انسانی بس میں آسکتے ہیں ، تو کیا انسانوں

ہیں ذی شعور، منصف مزاج اور دیانت دار لوگوں کی اتنی تعداد موجود نہیں ہے جو سب کو منوا سکے کہ یہ جنگی اڈے سمیٹ لو۔ یہ بم اور راکٹ، توپیں، بندوقیں سمندر میں غرق کر دو۔ اور ایک دوسرے پر قبضہ جمانے کے بجائے سب مل کر تسخیرِ کائنات کو چلو۔ جہاں جگہ کی کوئی تنگی نہیں ہے، جہاں کسی کو کسی سے الجھنے کی ضرورت نہیں ہے، جہاں لامحدود فضائیں ہیں۔ اور اَن گنت دنیائیں۔ مجھے یقین ہے کہ سب رکاوٹوں اور مشکلوں کے باوجود ہم لوگ اپنی انسانی برادری سے یہ بات منوا کر رہیں گے۔

مجھے یقین ہے کہ انسانیت جس نے اپنے دشمنوں سے آج تک کبھی ہار نہیں کھائی اب بھی فتح یاب ہو کر رہے گی۔ اور آخر کار جنگ و نفرت اور ظلم و کدورت کے بجائے ہماری باہمی زندگی کی بنا وہی ٹھہرے گی جس کی تلقین اب سے بہت پہلے فارسی شاعر حافظ نے کی تھی ؎

خلل پذیر بود ہر بنا کہ می بینی
مگر بنائے محبت کہ خالی از خلل است

فیض اَز فیض

اپنے بارے میں باتیں کرنے سے مجھے سخت وحشت ہوتی ہے اس لیے کہ سب بور لوگوں کا مرغوب شغل یہی ہے ۔ اس انگریزی لفظ کے لیے معذرت چاہتا ہوں لیکن اب تو ہمارے ہاں اس کے مشتقات بوریت وغیرہ بھی استعمال میں آنے لگے ہیں اس لیے اب اسے اردو روزمرّہ میں شامل سمجھنا چاہیے ۔ تو میں یہ کہہ رہا تھا کہ مجھے اپنے بارے میں قیل و قال بری لگتی ہے ۔ بلکہ میں تو شعر میں بھی حتی الامکان واحد متکلم کا صیغہ استعمال نہیں کرتا ، اور 'میں' کے بجائے ہمیشہ سے 'ہم' لکھتا آیا ہوں ۔ چنانچہ جب ادبی سراغرسان حضرات مجھ سے یہ پوچھنے بیٹھتے ہیں کہ تم شعر کیوں کہتے ہو' کیسے کہتے ہو اور کس لیے کہتے ہو تو بات کو ٹالنے کے لیے جو دل میں آئے کہہ دیتا ہوں ۔ مثلاً یہ کہ جیسے میں بھی

کہتا ہوں جس لیے بھی کہتا ہوں تم شعروں سے خود ڈھونڈ لو، میرا سر کھانے کی کیا ضرورت ہے۔ لیکن ان میں سے ڈھیٹ قسم کے لوگ جب بھی نہیں مانتے۔ چنانچہ آج کی گفتگو کی سب ذمّہ داری ان حضرات کے سر ہے مجھ پر نہیں ہے۔

شعر گوئی کا کوئی واحد عذرِ گناہ تو مجھے نہیں معلوم۔ اس میں بچپن کی فضائے گرد و پیش میں شعر کا چرچا، دوست احباب کی ترغیب اور دل کی لگی سبھی کچھ شامل ہے۔ یہ نقشِ فریادی کے پہلے حصے کی بات ہے جس میں ۲۹-۱۹۲۸ء سے ۳۵-۱۹۳۴ء تک کی تحریریں شامل ہیں، جو ہماری طالب العلمی کے دن تھے۔ یوں تو ان سب اشعار کا قریب قریب ایک ہی ذہنی اور جذباتی واردات سے تعلق ہے اور اس واردات کا ظاہری محرک تو وہی ایک حادثہ ہے جو اس عمر میں اکثر نوجوان دلوں پر گزر جایا کرتا ہے۔ لیکن اب جو دیکھتا ہوں تو یہ دَور بھی ایک دَور نہیں تھا بلکہ اس کے بھی دو الگ الگ حصّے تھے جن کی داخلی اور خارجی کیفیت کافی مختلف تھی۔ وہ یوں ہے کہ ۱۹۲۰ء سے ۱۹۳۰ء تک کا زمانہ ہمارے ہاں معاشی اور سماجی طور سے کچھ عجب طرح کی بے فکری

آسودگی اور ولولہ انگیزی کا زمانہ تھا جس میں اہم قومی اور سیاسی تحریکوں کے ساتھ ساتھ نثر و نظم میں بیشتر سنجیدہ فکر و مشاہدہ کے بجائے کچھ رنگ رلیاں منانے کا سا انداز تھا۔ شعر میں اوّلاً حسرت موہانی اور ان کے بعد جوش، حفیظ جالندھری اور اختر شیرانی کی ریاست قائم تھی، افسانے میں یلدرم اور تنقید میں حُسن برائے حُسن اور ادب برائے ادب کا چرچا تھا۔ نقشِ فریادی کی ابتدائی نظمیں، 'خدا وہ وقت نہ لائے کہ سوگوار ہو تو'، 'مری جاں اب بھی اپنا حسن واپس پھیر دے مجھ کو'، 'تہِ نجوم کہیں چاندنی کے دامن میں' وغیرہ وغیرہ اسی ماحول کے زیرِ اثر مرتّب ہوئیں اور اس فضا میں ابتدائے عشق کا تحیّر بھی شامل تھا۔ لیکن ہم لوگ اس دور کی ایک جھلک بھی ٹھیک سے نہ دیکھ پائے تھے کہ صحبتِ یار آخر شد۔ پھر دیس پر عالمی کساد بازاری کے سائے ڈھلنے شروع ہوئے۔ کالج کے بڑے بڑے بانکے تیس مار خاں تلاشِ معاش میں گلیوں کی خاک پھانکنے لگے۔ یہ وہ دن تھے جب یکایک بچوں کی ہنسی بجھ گئی، اُجڑے ہوئے کسان کھیت کھلیان چھوڑ کر شہروں میں مزدوری کرنے لگے اور اچھی خاصی شریف بہو بیٹیاں بازار میں آ بیٹھیں۔ گھر کے

باہر یہ حال تھا اور گھر کے اندر مرگِ سوزِ محبت کا کہرام مچا تھا - یکایک یوں محسوس ہونے لگا کہ دل و دماغ پر سبھی راستے بند ہو گئے ہیں اور اب یہاں کوئی نہیں کوئی نہیں آئے گا - اِس کیفیت کا اختتام جو نقشِ فریادی کے پہلے حصّے کی آخری نظموں کی کیفیت ہے ایک نسبتاً غیر معروف نظم پر ہوتا ہے جسے میں نے یاس کا نام دیا تھا - وہ نظم یوں ہے : -

'یاس'

بربطِ دل کے تار ٹوٹ گئے
ہیں زمیں بوس راحتوں کے محل
مٹ گئے قصّہ ہائے فکر و عمل
بزمِ ہستی کے جام پھوٹ گئے
چھن گیا کیفِ کوثر و تسنیم
زحمتِ گریہ و بکا بے سُود
شکوۂ بختِ نارسا بے سُود
ہو چکا ختم رحمتوں کا نزول
بند ہے مدّتوں سے بابِ قبول

بے نیازِ دعا ہے ربِّ کریم
بجھ گئی شمعِ آرزوئے جمیل
یاد باقی ہے بے کسی کی دلیل

انتظارِ فضول رہنے دے
رازِ الفت نباہنے والے
بارِ غم سے کراہنے والے
کاوشِ بے حصول رہنے دے

۱۹۳۴ء میں ہم لوگ کالج سے فارغ ہوئے اور ۱۹۳۵ء میں مَیں نے ایم اے او کالج امرتسر میں ملازمت کر لی۔ یہاں سے میری اور میرے بہت سے ہمعصر لکھنے والوں کی ذہنی اور جذباتی زندگی کا نیا دور شروع ہوتا ہے۔ اس دوران کالج میں اپنے رفقا صاحبزادہ محمود الظفر مرحوم اور ان کی بیگم رشید جہاں سے ملاقات ہوئی۔ پھر ترقی پسند تحریک کی داغ بیل پڑی، مزدور تحریکوں کا سلسلہ شروع ہوا اور یوں لگا کہ جیسے گلشن میں ایک نہیں کئی دبستاں کھل گئے ہیں۔ اس دبستان

میں سب سے پہلا سبق جو ہم نے سیکھا تھا کہ اپنی ذات کو باقی دنیا سے الگ کر کے سوچنا اوّل تو ممکن ہی نہیں اس لیے کہ اس میں بہرحال گرد و پیش کے سبھی تجربات شامل ہوتے ہیں اور اگر ایسا ممکن ہو بھی تو انتہائی غیر سود مند فعل ہے کہ ایک انسانی فرد کی ذات اپنی سب محبتوں اور کدورتوں مسرتوں اور رنجشوں کے باوجود بہت ہی چھوٹی سی بہت ہی محدود اور حقیر شے ہے ۔ اس کی وسعت اور پہنائی کا پیمانہ تو باقی عالمِ موجودات سے اس کے ذہنی اور جذباتی رشتے ہیں، خاص طور سے انسانی برادری کے مشترکہ دکھ درد کے رشتے ۔ چنانچہ غمِ جاناں اور غمِ دوراں تو ایک ہی تجربے کے دو پہلو ہیں ۔ اس نئے احساس کی ابتدا نقشِ فریادی کے دوسرے حصے کی پہلی نظم سے ہوتی ہے ۔ اس نظم کا عنوان ہے "مجھ سے پہلی سی محبت مری محبوب نہ مانگ" اور اگر آپ خاتون ہیں تو "مرے محبوب نہ مانگ"

"مجھ سے پہلی سی محبت مری محبوب نہ مانگ"

مجھ سے پہلی سی محبت مری محبوب نہ مانگ

میں نے سمجھا تھا کہ تو ہے تو درخشاں ہے حیات

تیرا غم ہے تو غمِ دہر کا جھگڑا کیا ہے
تیری صورت سے ہے عالم میں بہاروں کو ثبات
تیری آنکھوں کے سوا دنیا میں رکھا کیا ہے؟
تو جو مل جائے تو تقدیر نگوں ہو جائے

یوں نہ تھا، میں نے فقط چاہا تھا یوں ہو جائے
اور بھی دُکھ ہیں زمانے میں محبت کے سوا،
راحتیں اور بھی ہیں وصل کی راحت کے سوا،
ان گنت صدیوں کے تاریک بہیمانہ طلسم
ریشم و اطلس و کمخاب میں بنوائے ہُوئے
جا بجا بکتے ہوئے کوچہ و بازار میں جسم
خاک میں لتھڑے ہوئے خون میں نہلائے ہوئے

جسم نکلے ہوئے امراض کے تنوروں سے
پیپ بہتی ہوئی گلتے ہوئے ناسوروں سے
لوٹ جاتی ہے ادھر کو بھی نظر کیا کیجے
اب بھی دلکش ہے ترا حسن، مگر کیا کیجے

اور بھی دکھ ہیں زمانے میں محبّت کے سوا
راحتیں اور بھی ہیں وصل کی راحت کے سوا
مجھ سے پہلی سی محبّت مری محبوب نہ مانگ

اس کے بعد تیرہ چودہ برس "کیوں نہ جہاں کا غم اپنا لیں" میں گذرے اور پھر فوج، صحافت ٹریڈ یونین وغیرہ وغیرہ کرنے کے بعد ہم چار برس کے لیے جیل خانے چلے گئے، نقشِ فریادی کے بعد کی دو کتابیں "دستِ صبا" اور "زنداں نامہ" اسی جیل خانے کی یادگار ہیں۔ بنیادی طور سے تو یہ تحریریں انھیں ذہنی محسوسات اور معمولات سے منسلک ہیں جن کا سلسلہ مجھ سے پہلی سی محبّت سے شروع ہوا تھا لیکن جیل خانہ عاشقی کی طرح خود ایک بنیادی تجربہ ہے، جس میں فکر و نظر کا ایک آدھ نیا دریچہ خود بخود کھل جاتا ہے۔ چنانچہ اوّل تو یہ ہے کہ ابتدائے شباب کی طرح تمام حسّیات یعنی (Sensations) پھر تیز ہو جاتی ہیں اور صبح کی پو، شام کے دھندلکے، آسمان کی نیلاہٹ، ہوا کے گداز کے بارے میں وہی

پہلا سا تحیّر لوٹ آتا ہے۔ دوسرے یوں ہوتا ہے کہ باہر کی دنیا کا وقت اور فاصلے دونوں باطل ہو جاتے ہیں، نزدیک کی چیزیں بھی بہت دور ہو جاتی ہیں اور دور کی نزدیک اور فردا و دی کا تفرقہ کچھ اس طور سے مٹ جاتا ہے کہ کبھی ایک لمحہ قیامت معلوم ہوتا ہے اور کبھی ایک صدی کل کی بات، تیسری بات یہ ہے کہ فراغتِ ہجراں میں فکر و مطالعہ کے ساتھ عروسِ سخن کے ظاہری بناؤ سنگھار پر توجہ دینے کی زیادہ مہلت ملتی ہے۔ اس جیل خانے کے بھی دو دَور تھے۔ ایک حیدرآباد جیل کا جو اس تجربے کے انکشاف کے تحیّر کا زمانہ تھا، ایک منٹگمری جیل کا جو اس تجربے سے اکتاہٹ اور تھکن کا زمانہ تھا۔ ان دو کیفیتوں کی نمائندہ یہ دو نظمیں ہیں، پہلی "دستِ صبا" میں سے دوسری "زنداں نامہ" میں سے۔

زنداں کی ایک شام

شام کے پیچ و خم ستاروں سے
زینہ زینہ اُتر رہی ہے رات
یوں صبا پاس سے گذرتی ہے

جیسے کہہ دی کسی نے پیار کی بات
صحنِ زنداں کے بے وطن اشجار
سرنگوں، محو ہیں بنانے میں
دامنِ آسماں پہ نقش و نگار

شانۂ بام پر دمکتا ہے
مہرباں چاندنی کا دستِ جمیل
خاک میں گھل گئی ہے آبِ نجوم
نور میں گھل گیا ہے عرش کا نیل
سبز گوشوں میں نیلگوں سائے
لہلہاتے ہیں جس طرح دل میں
موجِ دردِ فراقِ یار آئے

دل سے پیہم خیال کہتا ہے
اتنی شیریں ہے زندگی اس پل

ظلم کا زہر گھولنے والے
کامراں ہو سکیں گے آج نہ کل
جلوہ گاہِ وصال کی شمعیں
وہ بجھا بھی چکے اگر تو کیا
چاند کو گل کریں تو ہم جانیں

"اے روشنیوں کے شہر"
سبزہ سبزہ سوکھ رہی ہے پھیکی زرد دوپہر
دیواروں کو چاٹ رہا ہے تنہائی کا زہر
دور اُفق تک گھٹتی، بڑھتی، اُٹھتی، گرتی رہتی ہے
کُہر کی صورت بے رونق دردوں کی گدلی لہر
بستا ہے اس کُہر کے پیچھے روشنیوں کا شہر

اے روشنیوں کے شہر
اے روشنیوں کے شہر

کون کہے کس سمت ہے تیری روشنیوں کی راہ

ہر جانب بے نور کھڑی ہے ہجر کی شہر پناہ
تھک کر ہر سُو بیٹھ رہی ہے شوق کی ماند سپاہ
آج مرا دل فکر میں ہے
اے روشنیوں کے شہر

شب خوں سے منہ پھیر نہ جائے ارمانوں کی رَو
خیر ہو تیری لیلاؤں کی، ان سب سے کہہ دو
آج کی شب جب دیے جلائیں اونچی رکھیں لو

زنداں نامے کے بعد کا زمانہ کچھ ذہنی افراتفری کا زمانہ ہے جس میں اپنا اخباری پیشہ چھٹا، ایک بار پھر جیل خانے گئے۔ مارشل لا کا دور آیا، اور ذہنی اور گرد و پیش کی فضا میں پھر سے کچھ انسدادِ راہ اور کچھ نئی راہوں کی طلب کا احساس پیدا ہوا۔ اس سکوت اور انتظار کی آئینہ دار ایک نظم ہے "شام" اور ایک نامکمل غزل کے چند اشعار: کب ٹھہرے گا درد اے دل، کب رات بسر ہو گی!

فیض

○

یہ خوں کی مہک ہے کہ لبِ یار کی خوشبو
کس راہ کی جانب سے صبا آتی ہے دیکھو
گلشن میں بہار آئی کہ زنداں ہوا آباد
کس سمت سے نغموں کی صدا آتی ہے دیکھو

دستِ تہِ سنگ آمدہ

بیزار فضا، درپئے آزارِ صبا ہے
یُوں ہے کہ ہر اک ہمدمِ دیرینہ خفا ہے
ہاں بادہ کشو آیا ہے اب رنگ پہ موسم
اب سیر کے قابل روشِ آب و ہوا ہے
اُمڈی ہے ہر اک سمت سے الزام کی برسات
چھائی ہوئی ہر دانگ ملامت کی گھٹا ہے
وہ چیز بھری ہے کہ سلگتی ہے صراحی
ہر کاسۂ مے زہرِ ہلاہل سے سوا ہے

ہاں جام اُٹھاؤ کہ بیادِ لبِ شیریں
یہ زہر تو یاروں نے کئی بار پیا ہے

اِس جذبۂ دل کی نہ سزا ہے نہ جزا ہے
مقصودِ رہِ شوق وفا ہے نہ جفا ہے

احساسِ غمِ دل جو غمِ دل کا صلا ہے
اُس حسن کا احساس ہے جو تیری عطا ہے

ہر صبحِ گلستاں ہے ترا روئے بہاریں
ہر پھول تری یاد کا نقشِ کفِ پا ہے

ہر بھیگی ہوئی رات تری زلف کی شبنم
ڈھلتا ہوا سورج ترے ہونٹوں کی فضا ہے

ہر راہ پہنچتی ہے تری چاہ کے در تک
ہر حرفِ تمنّا ترے قدموں کی صدا ہے
تعزیرِ سیاست ہے، نہ غیروں کی خطا ہے
وہ ظلم جو ہم نے دلِ وحشی پہ کیا ہے
زندانِ رہِ یار میں پابند ہوئے ہم
زنجیر بکف ہے، نہ کوئی بند بپا ہے
"مجبوری و دعوائے گرفتاریٔ اُلفت
دستِ تہِ سنگ آمدہ پیمانِ وفا ہے"

○

میخانوں کی رونق ہیں، کبھی خانقہوں کی
اپنا لی ہوس والوں نے جو رسم چلی ہے
دلداریٔ واعظ کو ہمیں باقی ہیں ورنہ
اب شہر میں ہر رندِ خرابات ولی ہے

سفرنامہ

(۱)

پیکنگ

یوں گماں ہوتا ہے بازو ہیں مرے ساٹھ کروڑ
اور آفاق کی حد تک مرے تن کی حد ہے
دل مرا کوہ و دمن دشت و چمن کی حد ہے

میرے کیسے میں ہے راتوں کا سیہ فام جلال
میرے ہاتھوں میں ہے صبحوں کی عنانِ گلگوں
میری آغوش میں پلتی ہے خدائی ساری
میرے مقدور میں ہے معجزۂ کن فیکوں

(۲)

سِنکیانگ

اب کوئی طبل بجے گا، نہ کوئی شاہسوار
صبحدم موت کی وادی کو روانہ ہو گا!
اب کوئی جنگ نہ ہو گی نہ کبھی رات گئے
خون کی آگ کو اشکوں سے بجھانا ہو گا

کوئی دل دھڑکے گا شب بھر، نہ کسی آنگن میں
وہمِ منحوس پرندے کی طرح آئے گا
سہم، خونخوار درندے کی طرح آئے گا

اب کوئی جنگ نہ ہوگی مئے و ساغر لاؤ
خوں لٹانا نہ کبھی اشک بہانا ہوگا
ساقیا! رقص کوئی رقصِ صبا کی صورت
مطربا! کوئی غزل رنگِ حنا کی صورت

○

بساطِ رقص پہ صد شرق و غرب سے سرِ شام
دمک رہا ہے تری دوستی کا ماہِ تمام

چھلک رہی ہے ترے حُسنِ مہرباں کی شراب
بھرا ہوا ہے لبالب ہر اک نگاہ کا جام

گلے میں تنگ ترے حرفِ لطف کی باہیں
پسِ خیال کہیں ساعتِ سفر کا پیام

ابھی سے یاد میں ڈھلنے لگی ہے صحبتِ شب
ہر ایک رُوئے حسیں ہو چلا ہے بیش حسیں

ملے کچھ ایسے جُدا یوں ہوئے کہ فیضؔ اب کے
جو دل پہ نقش بنے گا وہ گُل ہے داغ نہیں

ہانگ چاؤ
(چین)
جولائی ۱۹۵۶ء

جشن کا دن

جنوں کی یاد مناؤ کہ جشن کا دن ہے
صلیب و دار سجاؤ کہ جشن کا دن ہے

طرب کی بزم ہے بدلو دِلوں کے پیراہن
جگر کے چاک سلاؤ کہ جشن کا دن ہے

تنک مزاج ہے ساقی نہ رنگِ مے دیکھو
بھرے جو شیشہ، چڑھاؤ کہ جشن کا دن ہے

تمیزِ رہبر و رہزن کرو نہ آج کے دن
ہر اک سے ہاتھ ملاؤ کہ جشن کا دن ہے

ہے انتظارِ ملامت میں ناصحوں کا ہجوم
نظر سنبھال کے جاؤ کہ جشن کا دن ہے

وہ شورشِ غمِ دل جس کی لے نہیں کوئی
غزل کی دُھن میں سناؤ کہ جشن کا دن ہے

مارچ ۱۹۵۷ء

○

رات ڈھلنے لگی ہے سینوں میں
آگ سُلگاؤ آبگینوں میں
دلِ عُشّاق کی خبر لینا
پھُول کھِلتے ہیں اِن مہینوں میں

○

آج تنہائی کسی ہمدمِ دیریں کی طرح
کرنے آئی ہے مری ساقی گری شام ڈھلے
منتظر بیٹھے ہیں ہم دونوں کہ مہتاب اُبھرے
اور ترا عکس جھلکنے لگے ہر سائے تلے

اپریل ۱۹۵۷ء

شام

اِس طرح ہے کہ ہر اک پیڑ کوئی مندر ہے
کوئی اُجڑا ہوا، بے نور پرانا مندر
ڈھونڈتا ہے جو خرابی کے بہانے کب سے
چاک ہر بام، ہر اک در کا دمِ آخر ہے
آسماں کوئی پروہت ہے جو ہر بام تلے
جسم پر راکھ ملے، ماتھے پہ سیندور ملے
سرنگوں بیٹھا ہے چپ چاپ نہ جانے کب سے
اس طرح ہے کہ پسِ پردہ کوئی ساحر ہے

جس نے آفاق پہ پھیلایا ہے یوں سحر کا دام
دامنِ وقت سے پیوست ہے یوں دامنِ شام
اب کبھی شام بجھے گی نہ اندھیرا ہوگا
اب کبھی رات ڈھلے گی نہ سویرا ہوگا

آسماں آس لیے ہے کہ یہ جادو ٹوٹے
چُپ کی زنجیر کٹے، وقت کا دامن چھُوٹے
دے کوئی سنکھ دہائی، کوئی پایل بولے
کوئی بُت جاگے، کوئی سانولی گھونگھٹ کھولے

○

جمے گی کیسے بساطِ یاراں کہ شیشہ و جام بجھ گئے ہیں
سجے گی کیسے شبِ نگاراں کہ دل سرِ شام بجھ گئے ہیں

وہ تیرگی ہے رہِ بتاں میں چراغِ رُخ ہے نہ شمعِ وعدہ
کرن کوئی آرزو کی لاؤ کہ سب در و بام بجھ گئے ہیں

بہت سنبھالا وفا کا پیماں مگر وہ برسی ہے اب کے برکھا
ہر ایک اقرار مٹ گیا ہے تمام پیغام بجھ گئے ہیں

قریب آ اے مہِ شبِ غم، نظر پہ کُھلتا نہیں کچھ اس دم
کہ دل پہ کس کس کا نقش باقی ہے، کون سے نام بجھ گئے ہیں

بہار اب آ کے کیا کرے گی کہ جن سے تھا جشنِ رنگ و نغمہ
وہ گُل سرِ شاخ جل گئے ہیں، وہ دل تہِ دام بجھ گئے ہیں

تم یہ کہتے ہو اب کوئی چارہ نہیں!

تم یہ کہتے ہو وہ جنگ ہو بھی چکی!
جس میں رکھا نہیں ہے کسی نے قدم
کوئی اُترا نہ میداں میں، دشمن نہ ہم
کوئی صف بن نہ پائی، نہ کوئی علَم
منتشر دوستوں کو صدا دے سکا
اجنبی دشمنوں کا پتا دے سکا
تم یہ کہتے ہو وہ جنگ ہو بھی چکی
جس میں رکھا نہیں ہم نے اب تک قدم

تم یہ کہتے ہو اب کوئی چارا نہیں
جسم خستہ ہے، ہاتھوں میں یارا نہیں

اپنے بس کا نہیں بارِ سنگِ ستم
بارِ سنگِ ستم، بارِ کہسارِ غم
جس کو چھو کر سبھی اک طرف ہو گئے
بات کی بات میں ذی شرف ہو گئے

دوستو، کوئے جاناں کی نامہرباں
خاک پر اپنے روشن لہو کی بہار

اب نہ آئے گی کیا؟ اب کھلے گا نہ کیا
اس کفِ نازنیں پر کوئی لالہ زار؟
اس حزیں خامشی میں نہ لوٹے گا کیا
شورِ آوازِ حق، نعرۂ گیر و دار

شوق کا امتحاں جو ہُوا سو ہُوا
جسم و جاں کا زیاں جو ہُوا سو ہُوا
سُود سے پیشتر ہے زیاں اور بھی
دوستو، ماتمِ جسم و جاں اور بھی
اور بھی تلخ تر امتحاں اور بھی

جنوری ۱۹۵۸ء

نہ دید ہے نہ سخن، اب نہ حرف ہے نہ پیام
کوئی بھی حیلۂ تسکیں نہیں اور آس بہت ہے
امیدِ یار، نظر کا مزاج، درد کا رنگ
تم آج کچھ بھی نہ پوچھو کہ دل اُداس بہت ہے

○

بے دم ہوئے بیمار دوا کیوں نہیں دیتے
تم اچھے مسیحا ہو شفا کیوں نہیں دیتے

دردِ شبِ ہجراں کی جزا کیوں نہیں دیتے
خونِ دلِ وحشی کا صِلا کیوں نہیں دیتے

مٹ جائے گی مخلوق تو انصاف کرو گے؟
منصف ہو تو اب حشر اُٹھا کیوں نہیں دیتے

ہاں نکتہ ورو لاؤ لب و دل کی گواہی
ہاں نغمہ گرو ساز صدا کیوں نہیں دیتے

پیمانِ جنوں ہاتھوں کو شرمائے گا کب تک
دل والو، گریباں کا پتا کیوں نہیں دیتے

بربادیٔ دل جبر نہیں فیضؔ کسی کا
وہ دشمنِ جاں ہے تو بھلا کیوں نہیں دیتے

لاہور جیل
۳۱ دسمبر ۱۹۵۸ء

شورشِ زنجیر بسم اللہ

ہوئی پھر امتحانِ عشق کی تدبیر بسم اللہ
ہر اک جانب مچا کُہرامِ دار و گیر بسم اللہ
گلی کوچوں میں بکھری شورشِ زنجیر بسم اللہ

درِ زنداں پہ بلوائے گئے پھر سے جنوں والے
دریدہ دامنوں والے، پریشاں گیسوؤں والے
جہاں میں دردِ دل کی پھر ہوئی توقیر بسم اللہ
ہوئی پھر امتحانِ عشق کی تدبیر بسم اللہ

گِنو سب داغ دل کے، حسرتیں شوقیں نگاہوں کی
سرِ دربار پرسش ہو رہی ہے پھر گناہوں کی
کرو یارو شمارِ نالۂ شبگیر بسم اللہ

ستم کی داستاں، کشتہ دلوں کا ماجرا کہیے
جو زیرِ لب نہ کہتے تھے وہ سب کچھ برملا کہیے
مُصِر ہے محتسب رازِ شہیدانِ وفا کہیے
لگی ہے حرفِ ناگفتہ پر اب تعزیر بسم اللہ

سرِ مقتل چلو بے زحمتِ تقصیر بسم اللہ
ہوئی پھر امتحانِ عشق کی تدبیر بسم اللہ

لاہور جیل
جنوری ۱۹۵۹ء

آج بازار میں پا بجولاں چلو

چشمِ نم، جانِ شوریدہ کافی نہیں
تہمتِ عشق پوشیدہ کافی نہیں
آج بازار میں پا بجولاں چلو

دست افشاں چلو، مست و رقصاں چلو
خاک بر سر چلو، خوں بداماں چلو
راہ تکتا ہے سب شہرِ جاناں چلو

حاکمِ شہر بھی، مجمعِ عام بھی
تیرِ الزام بھی، سنگِ دشنام بھی
صبحِ ناشاد بھی، روزِ ناکام بھی

ان کا دمساز اپنے سوا کون ہے
شہرِ جاناں میں اب باصفا کون ہے
دستِ قاتل کے شایاں رہا کون ہے

رختِ دل باندھ لو دل فگارو چلو
پھر ہمیں قتل ہو آئیں یارو چلو

لاہور جیل
۱۱ر فروری سنہ ۱۹۵۹ء

○

یہ جفائے غم کا چارہ، وہ نجاتِ دل کا عالم
ترا حسن دستِ عیسیٰ، تری یاد رُوئے مریم

دل و جاں فدائے راہے کبھی آ کے دیکھ ہمدم
سرِ کوئے دلفگاراں شبِ آرزو کا عالم

تری دید سے سوا ہے ترے شوق میں بہاراں
وہ زمیں جہاں گری ہے ترے گیسوؤں کی شبنم

یہ عجب قیامتیں ہیں تری رہگزر میں گزراں
نہ ہوا کہ مر مٹیں ہم، نہ ہوا کہ جی اُٹھیں ہم

لو سُنی گئی ہماری، یوں پھرے ہیں دن کہ پھر سے
وہی گوشۂ قفس ہے، وہی فصلِ گُل کا ماتم

لاہور جیل
فروری سنہ ۱۹۵۹ء

قیدِ تنہائی

دُور آفاق پہ لہرائی کوئی نوُر کی لہر
خواب ہی خواب میں بیدار ہوا درد کا شہر
خواب ہی خواب میں بیتاب نظر ہونے لگی
عدم آبادِ جدائی میں سحر ہونے لگی
کاسۂ دل میں بھری اپنی صبوحی میں نے
گھول کر تلخیٔ دیروز میں امروز کا زہر

دُور آفاق پہ لہرائی کوئی نور کی لہر
آنکھ سے دُور کسی صبح کی تمہید لیے
کوئی نغمہ، کوئی خوشبو، کوئی کافر صورت
عدم آبادِ جدائی میں مسافر صورت
بے خبر گزری، پریشانیٔ اُمید لیے
گھول کر تلخیٔ دیروز میں امروز کا زہر
حسرتِ روزِ ملاقات رقم کی میں نے
دیس پردیس کے یارانِ قدح خوار کے نام
حُسنِ آفاق، جمالِ لب و رخسار کے نام

زندانِ قلعۂ لاہور
مارچ ۱۹۵۹ء

ہم خستہ تنوں سے محتسبو کیا مال منال کا پوچھتے ہو
جو عمر سے ہم نے بھر پایا سب سامنے لائے دیتے ہیں
دامن میں ہے مشتِ خاکِ جگر، ساغر میں ہے خونِ حسرتِ مے
لو ہم نے دامن جھاڑ دیا، لو جام الٹائے دیتے ہیں

قلعہ لاہور
مارچ ۱۹۵۹ء

حمد

ملکِ شہرِ زندگی تیرا
شکر کس طور سے ادا کیجے
دولتِ دل کا کچھ شمار نہیں
تنگدستی کا کیا گلہ کیجے

جو ترے حسن کے فقیر ہوئے
ان کو تشویشِ روزگار کہاں؟
درد بیچیں گے گیت گائیں گے
اس سے خوشوقت کاروبار کہاں؟

جام چھلکا تو جم گئی محفل
منّتِ لطفِ غمگسار کسے؟
اشک ٹپکا تو کھِل گیا گلشن
رنجِ کم ظرفیٔ بہار کسے؟

خوش نشیں ہیں کہ چشم و دل کی مراد　　دَیر میں ہے نہ خانقاہ میں ہے
ہم کہاں قسمت آزمانے جائیں　　ہر صنم اپنی بارگاہ میں ہے

کون ایسا غنی ہے جس سے کوئی
نقدِ شمس و قمر کی بات کرے
جس کو شوقِ نبرد ہو ہم سے
جائے تسخیرِ کائنات کرے

جون ۱۹۵۹ء

○

ترے غم کو جاں کی تلاش تھی ترے جاں نثار چلے گئے
تری رہ میں کرتے تھے سر طلب، سرِ رہگزار چلے گئے

تری کج ادائی سے ہار کے شبِ انتظار چلی گئی
مرے ضبطِ حال سے رُوٹھ کر مرے غمگسار چلے گئے

نہ سوالِ وصل، نہ عرضِ غم، نہ حکایتیں نہ شکایتیں
ترے عہد میں دلِ زار کے سبھی اختیار چلے گئے

یہ ہمیں تھے جن کے لباس پر سرِ رُو سیاہی لکھی گئی
یہی داغ تھے جو سجا کے ہم سرِ بزمِ یار چلے گئے

نہ رہا جنونِ رُخِ وفا، یہ رسن یہ دار کرو گے کیا،
جنھیں جرمِ عشق پہ ناز تھا وہ گناہ گار چلے گئے

جولائی ۱۹۵۹ء

○

آ گئی فصلِ سکوں چاک گریباں والو
سِل گئے ہونٹ، کوئی زخم سلے یا نہ سلے
دوستو بزم سجاؤ کہ بہار آئی ہے
کِھل گئے زخم، کوئی پھول کِھلے یا نہ کِھلے

اپریل ۱۹۵۹ء

○

ڈھلتی ہے موجِ مے کی طرح رات ان دنوں
کِھلتی ہے صبح گُل کی طرح رنگ و بُو سے پُر
ویراں ہیں جام پاس کرو کچھ بہار کا
دل آرزو سے پُر کرو، آنکھیں لہو سے پُر

○

کب ٹھہرے گا درد اے دل کب رات بسر ہو گی
سنتے تھے وہ آئیں گے سنتے تھے سحر ہو گی

کب جان لہو ہو گی، کب اشک گہر ہو گا
کس دن تری شنوائی اے دیدۂ تر ہو گی

کب مہکے گی فصلِ گل کب بہکے گا مے خانہ
کب صبحِ سخن ہو گی کب شامِ نظر ہو گی

واعظ ہے نہ زاہد ہے، ناصح ہے نہ قاتل ہے
اب شہر میں یاروں کی کس طرح بسر ہو گی

کب تک ابھی رہ دیکھیں اے قامتِ جانانہ
کب حشر معیّن ہے تجھ کو تو خبر ہو گی

دو مرثیے

(۱)

ملاقات مری

ساری دیوار سیہ ہو گئی تا حلقۂ بام
راستے بجھ گئے رخصت ہوئے رہگیر تمام
اپنی تنہائی سے گویا ہوئی پھر رات مری
ہو نہ ہو آج پھر آئی ہے ملاقات مری
اِک ہتھیلی پہ حنا، ایک ہتھیلی پہ لہو
اک نظر زہر لیے ایک نظر میں دارو

—

دیر سے منزلِ دل میں کوئی آیا نہ گیا
فرقتِ درد میں بے آب ہُوا تختۂ داغ
کس سے کہیے کہ بھرے رنگ سے زخموں کے ایاغ
اور پھر خود ہی چلی آئی ملاقات مری
آشنا موت جو دشمن بھی ہے غمخوار بھی ہے
وہ جو ہم لوگوں کی قاتل بھی ہے دلدار بھی ہے

(۲)

ختم ہوئی بارشِ سنگ

ناگہاں آج مرے تارِ نظر سے کٹ کر
ٹکڑے ٹکڑے ہوئے آفاق پہ خورشید و قمر
اب کسی سمت اندھیرا نہ اُجالا ہوگا
بجھ گئی دل کی طرح راہِ وفا میرے بعد
دوستو! قافلۂ درد کا اب کیا ہوگا

اب کوئی اور کرے پرورشِ گلشنِ غم
دوستو ختم ہوئی دیدۂ تر کی شبنم
تھم گیا شورِ جنوں ختم ہوئی بارشِ سنگ
خاکِ رہ آج لیے ہے لبِ دلدار کا رنگ
کوئے جاناں میں کھلا میرے لہو کا پرچم
دیکھیے دیتے ہیں کس کس کو صدا میرے بعد
"کون ہوتا ہے حریفِ مئے مرد افگنِ عشق
ہے مکرّر لبِ ساقی پہ صلا میرے بعد"

نومبر سنہ ۱۹۶۰ء

○

ان دنوں رسم و رہِ شہرِ نگاراں کیا ہے
قاصدا، قیمتِ گلگشتِ بہاراں کیا ہے
کوئے جاناں ہے کہ مقتل ہے کہ میخانہ ہے
آج کل صورتِ بربادیٔ یاراں کیا ہے

○

آج یوں موج در موج غم تھم گیا اس طرح غمزدوں کو قرار آ گیا
جیسے خوشبوئے زلفِ بہار آ گئی جیسے پیغامِ دیدارِ یار آ گیا

جس کی دید و طلب وہم سمجھے تھے ہم رُوبرُو پھر سرِ رہ گزار آ گیا
صبحِ فردا کو پھر دل ترسنے لگا، عمرِ رفتہ ترا اعتبار آ گیا

رُت بدلنے لگی رنگِ دل دیکھنا، رنگِ گلشن سے اب حال کھلتا نہیں
زخم چھلکا کوئی یا کوئی گل کھِلا، اشک اُمڈے کہ ابرِ بہار آ گیا

خونِ عُشّاق سے جام بھرنے لگے، دل سلگنے لگے، داغ جلنے لگے
محفلِ دردپھر رنگ پر آگئی، پھر شبِ آرزو پر نکھار آگیا

سرفروشی کے انداز بدلے گئے، دعوتِ قتل پر مقتلِ شہر میں
ڈال کر کوئی گردن میں طوق آگیا، لاد کر کوئی کاندھے پہ دار آگیا

فیضؔ کیا جانیے یار کس آس پر، منتظر ہیں کہ لائے گا کوئی خبر
میکشوں پر ہوا محتسب مہرباں، دلفگاروں پہ قاتل کو پیار آگیا

کہاں جاؤ گے

اور کچھ دیر میں لُٹ جائے گا ہر بام پہ چاند
عکس کھو جائیں گے آئینے ترس جائیں گے
عرش کے دیدۂ نمناک سے باری باری
سب ستارے سرِ خاشاک برس جائیں گے
آس کے مارے تھکے ہارے شبستانوں میں
اپنی تنہائی سمیٹے گا بچھائے گا کوئی

بے وفائی کی گھڑی، ترکِ مدارات کا وقت
اس گھڑی اپنے سوا یاد نہ آئے گا کوئی
ترکِ دنیا کا سماں، ختمِ ملاقات کا وقت
اس گھڑی اے دلِ آوارہ کہاں جاؤ گے
اِس گھڑی کوئی کِسی کا بھی نہیں، رہنے دو
کوئی اِس وقت ملے گا ہی نہیں رہنے دو
اور ملے گا بھی تو اِس طور کہ پچھتاؤ گے
اِس گھڑی اے دلِ آوارہ کہاں جاؤ گے

اور کچھ دیر ٹھہر جاؤ کہ پھر نشترِ صبح

زخم کی طرح ہر اک آنکھ کو بیدار کرے
اور ہر کشتۂ واماندگیٔ آخرِ شب
بھُول کر ساعتِ درماندگیٔ آخرِ شب
جان پہچان ملاقات پہ اصرار کرے

دسمبر ۱۹۶۱ء

○

یک بیک شورشِ فغاں کی طرح
فصلِ گل آئی امتحاں کی طرح

صحنِ گلشن میں بہرِ مشتاقاں
ہر روش کھنچ گئی کماں کی طرح

پھر لہو سے ہر ایک کاسۂ داغ
پُر ہوا جامِ ارغواں کی طرح

یاد آیا جنونِ گم گشتہ
بے طلب قرضِ دوستاں کی طرح

جانے کِس پر ہو مہرباں قاتل
بے سبب مرگِ ناگہاں کی طرح

ہر صدا پر لگے ہیں کان یہاں
دل سنبھالے رہو زباں کی طرح

مئی ۱۹۶۲ء

شہرِ یاراں

آسماں کی گود میں دم توڑتا ہے طفلِ ابر
جم رہا ہے ابر کے ہونٹوں پہ خوں آلود کف
بجھتے بجھتے بجھ گئی ہے عرش کے حجروں میں آگ
دھیرے دھیرے بچھ رہی ہے ماتمی تاروں کی صف
اے صبا شاید ترے ہمراہ یہ خوں ناک شام
سر جھکائے جا رہی ہے شہرِ یاراں کی طرف
شہرِ یاراں جس میں اس دم ڈھونڈتی پھرتی ہے موت
شیر دل بانکوں میں اپنے تیر و نشتر کے ہدف

اِک طرف بجتی ہیں جوشِ زیست کی شہنائیاں
اک طرف چنگھاڑتے ہیں اہرمن کے طبل و دف

جا کے کہنا اے صبا، بعد از سلامِ دوستی
آج شب جس دم گزر ہو شہرِ یاراں کی طرف
دشتِ شب میں اس گھڑی چپ چاپ ہے شاید رواں
ساقیِ صبحِ طرب، نغمہ بلب، ساغر بکف
وہ پہنچ جائے تو ہو گی پھر سے برپا انجمن
اور ترتیبِ مقام و منصب و جاہ و شرف

نہ گنواؤ ناوکِ نیم کش دلِ ریزہ ریزہ گنوا دیا
جو بچے ہیں سنگ سمیٹ لو تنِ داغ داغ لٹا دیا

مرے چارہ گر کو نوید ہو صفِ دشمناں کو خبر کرو
جو وہ قرض رکھتے تھے جان پر وہ حساب آج چکا دیا

کرو کج جبیں پہ سرِ کفن مرے قاتلوں کو گماں نہ ہو
کہ غرورِ عشق کا بانکپن پسِ مرگ ہم نے بھلا دیا

اُدھر ایک حرف کہ کشتنی یہاں لاکھ عذر تھا گفتنی
جو کہا تو سُن کے اڑا دیا جو لکھا تو پڑھ کے مٹا دیا

جو رُکے تو کوہِ گراں تھے ہم جو چلے تو جاں سے گزر گئے
رہِ یار ہم نے قدم قدم تجھے یادگار بنا دیا

خوشا ضمانتِ غم

دیارِ یار تری جوششِ جنوں پہ سلام
مرے وطن ترے دامانِ تار تار کی خیر
رہِ یقیں تری افشانِ خاک و خوں پہ سلام
مرے چمن ترے زخموں کے لالہ زار کی خیر
ہر ایک خانۂ ویراں کی تیرگی پہ سلام
ہر ایک خاک بسر، خانماں خراب کی خیر
ہر ایک کشتۂ ناحق کی خامشی پہ سلام
ہر ایک دیدۂ پرنم کی آب و تاب کی خیر

روان رہے یہ روایت، خوشا ضمانتِ غم
نشاطِ ختمِ غمِ کائنات سے پہلے
ہر اک کے ساتھ رہے دولتِ امانتِ غم
کوئی نجات نہ پائے نجات سے پہلے
سکوں ملے نہ کبھی تیرے پا فگاروں کو
جمالِ خونِ سرِ خار کو نظر نہ لگے
اماں ملے نہ کہیں تیرے جاں نثاروں کو
جلالِ فرقِ سرِ دار کو نظر نہ لگے

لندن ۱۹۶۲ء

جب تیری سمندر آنکھوں میں

(گیت)

یہ دُھوپ کنارا، شام ڈھلے
ملتے ہیں دونوں وقت جہاں
جو رات نہ دن، جو آج نہ کل
پل بھر کو امر، پل بھر میں دھُواں
اس دھوپ کنارے، پل دو پل
ہونٹوں کی لپک
باہوں کی چھنک

یہ میل ہمارا، جھوٹ نہ سچ
کیوں راز کرو، کیوں دوش دھرو
کس کارن جھوٹی بات کرو
جب تیری سمندر آنکھوں میں
اِس شام کا سورج ڈوبے گا
سُکھ سوئیں گے گھر دَر والے
اور راہی اپنی رہ لے گا

(لندن سے)
سنہ ۱۹۶۳ء

رنگ ہے دل کا مرے

تم نہ آئے تھے تو ہر چیز وہی تھی کہ جو ہے
آسماں حدِّ نظر، راہگزر راہگزر، شیشۂ مے شیشۂ مے
اور اب شیشۂ مے، راہگزر، رنگِ فلک،
رنگ ہے دل کا مرے "خونِ جگر ہونے تک"
چمپئی رنگ کبھی راحتِ دیدار کا رنگ
سرمئی رنگ کہ ہے ساعتِ بیزار کا رنگ
زرد پتّوں کا، خس و خار کا رنگ
سرخ پھولوں کا دہکتے ہوئے گلزار کا رنگ

زہر کا رنگ، لہو رنگ، شبِ تار کا رنگ
آسماں، راہگزر، شیشۂ مے،
کوئی بھیگا ہوا دامن، کوئی دُکھتی ہوئی رگ
کوئی ہر لحظہ بدلتا ہوا آئینہ ہے

اب جو آئے ہو تو ٹھہرو کہ کوئی رنگ، کوئی رُت، کوئی شے،
ایک جگہ پر ٹھہرے،
پھر سے اک بار ہر اک چیز وہی ہو کہ جو ہے
آسماں حدِّ نظر، راہگزر راہگزر، شیشۂ مے شیشۂ مے

ماسکو
اگست ۱۹۶۳ء

پاس رہو

تم مرے پاس رہو
میرے قاتل، مرے دلدار، مرے پاس رہو،
جس گھڑی رات چلے،
آسمانوں کا لہو پی کے سیہ رات چلے
مرہمِ مشک لیے، نشترِ الماس لیے
بین کرتی ہوئی ہنستی ہوئی، گاتی نکلے
درد کے کاسنی پازیب بجاتی نکلے
جس گھڑی سینوں میں ڈوبے ہوئے دل

آستینوں میں نہاں ہاتھوں کی رہ تکنے لگیں
آس لیے
اور بچوں کے بلکنے کی طرح قُلقُلِ مے
بہرِ ناسودگی مچلے تو منائے نہ منے
جب کوئی بات بنائے نہ بنے
جب نہ کوئی بات چلے
جس گھڑی رات چلے
جس گھڑی ماتمی، سنسان، سیہ رات چلے
پاس رہو
میرے قاتل، مرے دلدار مرے پاس رہو

ماسکو، ۱۹۶۲ء

○

تری امید ترا انتظار جب سے ہے
نہ شب کو دن سے شکایت، نہ دن کو شب سے ہے

کسی کا درد ہو کرتے ہیں تیرے نام رقم
گلہ ہے جو بھی کسی سے ترے سبب سے ہے

ہوا ہے جب سے دلِ ناصبور بے قابو
کلام تجھ سے نظر کو بڑے ادب سے ہے

اگر شرر ہے تو بھڑکے، جو پھول ہے تو کھلے
طرح طرح کی طلب، تیرے رنگِ لب سے ہے

کہاں گئے شبِ فرقت کے جاگنے والے
ستارۂ سحری ہم کلام کب سے ہے

بمبئی ۱۹۵۶ء

○

شرحِ فراق، مدحِ لبِ مشکبو کریں
غربت کدے میں کس سے تری گفتگو کریں

یارِ آشنا نہیں کوئی ٹکرائیں کس سے جام
کس دل رُبا کے نام پہ خالی سَبُو کریں

سینے پہ ہاتھ ہے، نہ نظر کو تلاشِ بام
دل ساتھ دے تو آج غمِ آرزو کریں

کب تک سنے گی رات، کہاں تک سنائیں ہم
شکوے گلے سب آج ترے رو برو کریں

—

ہمدم حدیثِ کوئے ملامت سنائیو،
دل کو لہو کریں کہ گریباں رفو کریں

آشفتہ سر ہیں، محتسبو، منہ نہ آئیو
سر بیچ دیں تو فکرِ دل و جاں عدو کریں

"تر دامنی پہ شیخ، ہماری نہ جائیو
دامن نچوڑ دیں تو فرشتے وضو کریں"